بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

جس معاشرے میں آدمی خدمتِ دین کر رہا ہو، اُسے ہر پہلو سے اچھی طرح سمجھنا چاہیے۔ بیج ڈالنے والے کسان کو معلوم ہونا چاہیے کہ کھیتی کیسی ہے، اس کے زرخیز قطعات زیادہ ہیں یا بنجر؟ اور وہ کہاں کہاں ہیں؟

ہمارا موجودہ معاشرہ دولت پرست اور اسراف پسند معاشرہ ہے۔ ترقی کے نام سے معیارِ زندگی کو بڑھانے کی جو دوڑ دنیا بھر میں لگ رہی ہے، اس سے اہلِ پاکستان کا پہلے زیادہ تعلق نہ تھا۔ ۱۹۵۰ء کے بعد یہ رَو ہلکی ہلکی محدود دائروں میں شروع ہوئی، ۱۹۶۲ء کے بعد یہ قدرے تیز ہوگئی اور اس کا دائرہ بھی پھیل گیا۔ ۱۹۷۰ء کے بعد اس نے ایک طوفان کی شکل اختیار کر لی۔ پہلے تو یوں سوچا جاتا تھا کہ کون سے لوگ اس وبا میں مبتلا ہیں، اب دل دردمند رکھنے والے عناصر یہ جاننا چاہتے ہیں کہ کون سے لوگ اس سے محفوظ ہیں، —— پورے محفوظ نہ سہی، واجبی حد تک!

مگر اب یہ طوفان کُوبہ کُو اور گھر بہ گھر دندنا رہا ہے۔ ہر سطح کے گھروں اور افراد کے سامنے قطعۂ زمین، مکان یا کوٹھی، اسکوٹر یا کار، ٹیلی وژن اور فرج، ایئرکنڈیشنر اور کپڑے دھونے کی مشین، قالین اور فرنیچر، جدید چولہے اور ہیٹر، گدے دار پلنگ اور دروازوں کھڑکیوں کے پردوں کی بے حساب خواہشات کی لمبی فہرست ہے اور وہ ان میں سے باری باری ایک ایک چیز کے حصول کو منزل بنا کر دوڑ لگا رہا ہے۔ اس دَور میں ہانپتے ہوئے وہ دینی عبادات و شعائر،

خاندانی روایات، مہذبانہ اقدار، درخشاں اخلاقیات کے بھاری خزانوں کو اس لیے پھینک رہا ہے کہ یہ دوڑ میں حائل ہوتے ہیں۔ وہ حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی تمیز سے بے نیاز ہو کر ہر قیمت پر روپے کو حاصل کرنا اور آمدنی کو بڑھانا چاہتا ہے۔ رشوت ہو کہ اسمگلنگ، ملاوٹ ہو کہ بھاری منافع اور گراں فروشی، قومی املاک میں خیانت ہو یا عام امانات میں خورد برد ——— اور ان چیزوں سے آگے بڑھ کر چوری، لوٹ مار، جیب تراشی، سڑکوں پر بسیں روک کر ڈاکہ زنی، خرکاروں کے لیے بچوں کا اور جنسی گندگی پھیلانے والوں کے لیے عورتوں کا اغوا، اور سب سے بڑھ کر قتل ——— یہ سارے جرائم لوگوں کو پسند آ رہے ہیں۔ دیدہ دلیری کی حد یہ ہے کہ نہ صرف سرکاری کاغذات کے اندراجات سے بے پروا ہو کر پلاٹوں اور عمارتوں پر قبضے جما لیے جاتے ہیں، دکانوں اور مکانوں کو کرایہ پر دینے کے لیے ہزاروں روپے کی پگڑیاں وصول کی جاتی ہیں، بلکہ صدہا واقعات ایسے ہیں کہ ایک شخص کسی دوسرے کی زمین کو اسی کے نام فروخت کرتا ہے اور خود عدالت میں جا کر رجسٹری کراتا ہے اور اسے گراں بہا رقم مفت میں ہاتھ آ جاتی ہے۔ بچے امتحانات کے کمروں میں نگرانوں کی آنکھوں کے نیچے نقل کرتے ہیں، کتابیں اور نوٹس یکے بعد دیگرے منتقل ہوتے ہیں اور جرم و خیانت کی قوت اتنی زبردست ہے کہ کوئی دم نہیں مار سکتا۔ رہی سہی کسر طلبہ کے والدین اور سرپرست اپنے محبتوں اور دوستوں کی مدد سے پوری کرتے ہیں۔ وہ پرچوں کا باقاعدہ تعاقب کرتے ہیں اور نمبر لگانے والے ممتحنوں کو سفارش یا رشوت یا دھمکی کے بل پر مجبور کر دیتے ہیں کہ وہ اُن کے فیل ہونے والے بچے کو فسٹ کلاس کے پاس نمبر دیں۔ اس سطح پر کام نہ بنے تو پھر اگلی منزل ہیڈ ایگزامینر ہوتے ہیں۔ وہاں کوئی مشکل ہو تو نتیجہ مرتب کرنے والے عملے سے گٹھ جوڑ کر لیا جاتا ہے۔ یہ بھی نہ ہو سکے تو جعلی ڈگریوں اور ڈپلوموں کا دروازہ اسی طرح کھلا ہے جیسے جعلی پاسپورٹوں اور ویزوں اور سرٹیفکیٹوں کا۔

پھر ایک بلا یہ نازل ہوئی ہے کہ کچھ تو کاریگروں اور مزدوروں کی کمی کی وجہ سے، اور کچھ یہ دیکھ کر کہ اُن کے بھائی بند چند سو میل کی دوری پر اُن سے چار گنا کمائی کر رہے ہیں انہوں نے اپنے نرخوں اور اُجرتوں میں بھاری اضافے کر دیے ہیں۔ ایک پلمبر پندرہ منٹ میں اور ایک بجلی کا اناڑی مستری ایک گھنٹے میں اتنا کما لیتا ہے جتنا تعلیم یافتہ لوگ دو تین گھنٹوں میں، لیکن ستم یہ کہ کام چوری

اور کام میں نالائقی اور خیانت کاری مزید بڑھ گئی ہے۔ کارخانوں میں مزدور اور دفتروں میں بابو نہ پوری حاضری دیتے ہیں، نہ پورا اور معیاری کام کرتے ہیں مگر تنخواہوں اور اجرتوں کے اضافے کے لیے ہر ماہ تیار۔ درحقیقت یہ ایک بہت ہی وسیع سلسلۂ خیانت ہے۔

خدا کے کچھ نیک دل اور شریف بندے اگر اچھے اصول و اخلاق کے تحت ان مفاسد سے پرہیز کر کے نقصان اٹھاتے ہیں تو سارا معاشرہ اب انہیں اگلے وقتوں کے بیوقوف سمجھتا ہے حتیٰ کہ خود اُن کے بیوی بچے بھی ایک نہ ایک دن انہیں اپنی اس رائے سے آگاہ کر دیتے ہیں کہ تم نے اپنے خیالی اصولوں اور بے فیض اخلاقیات کی وجہ سے ہم سب کو پسماندگی میں جھونک دیا ہے۔ وہ چند گھرانے بڑے عظیم ہوں گے جن کی خواتین اور بچے گھروں کے سربراہوں کے ایمان و اخلاق پر "ترقی" میں حائل ہونے کے باوجود راضی ہوں۔ معاشرے کی اصل دینی قوت ایسے ہی گھرانوں میں جڑیں رکھتی ہیں۔

اِس آگ کو "دوبئی ازم" نے اور بھڑکا دیا ہے۔

دوبئی ازم سے میری مراد کوئی خاص ملک نہیں ہے، بلکہ وہ دوبئی ہو یا سعودی عرب، ناروے اور بلجیم ہوں یا برطانیہ اور امریکہ "دولت پرستوں" کے لیے یکساں متبرک مقامات ہیں۔ یہاں سے وہاں تک ایک دوڑ لگ رہی ہے۔ گاؤں یا محلے کا ایک شخص جاتا ہے اور کچھ دنوں بعد جب روپیہ اس کے گھر میں ناچنے لگتا ہے تو اڑوس پڑوس میں مائیں اپنے بیٹوں کو اور بیویاں اپنے شوہروں کو باہر جانے کی اس طرح تلقین کرنے لگتی ہیں جیسے سچے مسلم معاشرے کی مائیں جہاد اور ہجرت اور حج کی تلقین کیا کرتی تھیں۔ بچہ ماں کی گود میں ہوتا ہے تو وہ اُس کے کانوں میں ڈالنے لگتی ہے کہ تم بڑے ہو کر باہر جاؤ گے اور سارے گھر کو دولت سے بھر دو گے۔ بعید نہیں کہ اب ایسی لوریاں رواج پا جائیں جن میں معصوم جانوں کے ذہن سادہ پر یہ نقش خوب گہرا کر دیا جائے کہ زندگی کا سب سے بڑا مقصد دولت کمانا ہے اور دولت کمانے کے لیے دوبئی اور ابوظہبی، یا برطانیہ و امریکہ جانا واجب ہے۔

دُنیا کی ضروریات پوری کرنے کے لیے روپیہ کمانا، یا معاشی تگ و دو کے لیے ملک سے باہر جانا منع نہیں ہے۔ اصل مصیبت یہ ہے کہ جانے والے ایک تو مغربی کلچر کے کالبد سے گزر کر آتے ہیں اور بیرونی سامانوں کے ساتھ وہاں کے آداب و شعائر بھی سامان لے آتے ہیں۔ دوسری یہ کہ وہ اپنے معاشرے کی سطح

سے کئی گنا زیادہ کمائی کرنے کی وجہ سے باہر کی مسرفانہ زندگیاں گزار کے آتے ہیں تو یہاں بھی ان کا ذہن اور اُن کا وافر روپیہ اُن کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنے معاشرے کے سامنے خوب خراچ بن کر دکھائیں اور فخر کریں۔ بلکہ جو بے صلاحیت لوگ باہر جھاڑو دے کر کام چلاتے ہیں، اور کھانے لباس اور رہائش میں انتہائی کنجوسی کر کے گھٹیا زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ بھی واپس آ کر اپنے ماحول میں بڑے ٹھاٹھ باٹھ دکھلاتے ہیں، جیسے کہ جناب سونے کی کان سے مال نکال لائے ہیں۔ ان کے سامنے آنے اور گھر میں سجنے والے سامان، مشینیں اور الیکٹرانکس اُن کے اپنے اور بیگمات اور بچوں کے نظر فریب ملبوسات اور دکانوں پر اُن کی نوابانہ خریداری کثیر تعداد کو مبہوت کر دیتی ہے۔ قسائی کے ہاں گئے تو دہ سیر گوشت کا آرڈر دیا۔ پھل والے کے ہاں پہنچے تو پانچ منٹ میں سو روپے کا پھل اُٹھوا لیا۔ زمین کا پلاٹ خریدنے نکلے تو بھاری سے بھاری قیمت بآسانی ادا کرنے کو تیار۔ تعمیر شروع کرائی تو لاکھوں کے وارے نیارے ہو گئے، کوئی تقریب گھر میں ہوئی تو گویا عباسی دور کے دربار شاہی کا کوئی جشن منعقد ہو گیا۔ ضروریاتِ زندگی کے تیزی سے مہنگا ہونے کی وجہ نہ صرف افراطِ زر ہے بلکہ زیادہ مؤثر وہ مسرفانہ رویّہ ہے جو دوبئی اور امریکہ سے آنے والا روپیہ پیدا کرتا ہے۔ اِن حضرات کے اعزاز کے لیے ہوائی اڈوں پر ٹیکسیوں کے کرایے تگنے چوگنے ہو گئے اور معمولی آمدنی کے مقامی لوگوں کو بھی یہ نیا بوجھ اُٹھانا پڑا۔

یہ بوجھ ایک ہی مد میں نہیں، ہر مد میں اسی طرح باہر نہ جانے والوں پر لد گیا ہے۔

ایسے مضحکہ انگیز واقعات میرے سامنے ہیں کہ کسی کور دِہ میں ٹیلی وژن لگا ہے اور اس کے لیے بجلی جنریٹر سے پیدا کی جاتی ہے۔

ایک شخص اَن پڑھ بھائی یا بیٹے کے لیے گھڑی بھیجتا ہے اور وہ اس قابل نہیں کہ بیٹری والی نئی گھڑی کے ڈائیل کو اچھی طرح پڑھ سکے۔ گڈریا بکریاں چرا رہا ہے اور چار بینڈ کا ریڈیو کیکر کی جھاڑیوں میں رکھ کر ایسے نغمے سُن رہا ہے جن کو وہ سمجھ نہیں سکتا۔ بوڑھی نانیوں اور دادیوں کی کلائیوں پر گھڑیاں بندھی ہیں۔

کیا یہ دولت جیسی نعمتِ خداوندی کے ساتھ مذاق نہیں ہے۔

وجہ خرابی یہ بھی تو ہے کہ کم تعلیم یافتہ (بلکہ اَن پڑھ) اور کم صلاحیت کے لوگ چار چار سال میں اُس

مالی سطح پر جا پہنچے جہاں یہاں کے قابل حضرات مدتوں میں نہ پہنچ سکے۔ اس لحاظ سے یہ ایک نئی قسم کے نو دولتیوں کی کلاس ہے۔ اور اس نے نئے مسائل پیدا کر دیئے ہیں۔ اس نے دولت پرستی اور اسراف پسندی کی وبا کو حد سے زیادہ بڑھا دیا ہے۔ یہ کلاس ہوائی جہازوں میں سفر کرتی ہے اور بیشتر سیٹیں اسی کے پاس ہوتی ہیں۔ یہ لوگ اپنے بچوں کو یہاں لائیں تو کنڈرگارٹن اور انگلش میڈیم سکولوں اور کالجوں میں داخل کراتے ہیں۔ ان کی خواتین تک یہاں کی عورتوں پر گرفت کرتی ہیں کہ "باہر کا کپڑا" تو ہے نہیں ---------- کم درجے کے لوگ جب بھی گھر آتے ہیں تو ہر دفعہ ٹیپ ریکارڈر، ریڈیو گرام، مختصر موس، کیمرے وغیرہ ساتھ لاتے ہیں۔ کوئی چیز پاس رکھی، کسی کو بیچ کر خاصی کمائی یہاں کر لی۔ بڑے لوگ کاریں، فریج، ٹیلی وژن، ٹرک، ٹریکٹر، منی بسیں، بڑی بسیں، کپڑے دھونے کی مشینیں ساتھ لاتے ہیں اور اپنی دولت کی قوت سے یہاں کے پرانے کاروباریوں کے مقابلے میں میدان میں آجاتے ہیں۔ ذرا سوچیے کہ کتنا زرمبادلہ ہر سال پاکستان کے بجائے دوسروں کی جیب میں جاتا ہے۔ یہی اگر ہمارے پاس رہے تو دفاع یا صنعت و زراعت میں کتنی تیزی سے ترقی ہو سکتی ہے۔ انڈیا کے لوگ بھی ہم سے زیادہ ہی باہر کمائی کرتے ہیں مگر حکومت کی طرف سے اجازت نہیں کہ وہ ہر بار جدید قیمتی سامانوں سے لدے پھندے ملک میں داخل ہوں۔

میں معذرت کرتا ہوں کہ جس طرح ملک کے اندر کے لوگ میرے بھائی ہیں، اسی طرح مجھے باہر جا کر معاشی تگ و دو کرنے والے بھی عزیز ہیں۔ میں دونوں کا احترام کرتا ہوں۔ مگر ایک خاص صورت حال کی وجہ سے جو مسائل پیدا ہو رہے ہیں اُن پر بحث کیے بغیر ہم اپنی فلاح و بہبود پر غور ہی نہیں کر سکتے بخصوص دین کی خدمت کرنے والے لوگ اپنا فریضہ صحیح طور پر انجام نہیں دے سکتے۔

ہمارے موجودہ دولت پرستانہ ماحول میں یہ حقیقت کسی کو یاد ہی نہیں کہ دولت اللہ تعالیٰ کی امانت ہے اور جسے کمانے اور خرچ کرنے کا یہ اصول نہیں کہ جیسے جی چاہے ---- اس حقیقت کے نظروں سے اوجھل ہو جانے کی وجہ سے اسراف پسندانہ رجحانات زور پکڑ گئے ہیں۔

لباسوں بخصوص خواتین کی ساڑھیوں اور غراروں، بیل باٹم اور دوسرے ملبوسات کا اسراف یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ کسی زنانہ ادارے میں چلے جائیے تو معلوم ہوگا کہ فاخرہ لباسوں کا کوئی مقابلہ ہو

رہا ہے۔ راہ چلتی خواتین کی بیشتر تعداد کو دیکھ کر بھی یہی گمان گزرے گا کہ کسی مینا بازار کو جا رہی ہیں۔ پھر فیشنوں کا برسات کے موسم کی طرح نت نئے رنگ بدلنا، پھر آرائش کے سامانوں کا استعمال اور خضاب اور مصنوعی چوٹیوں اور سو سو روپے تک کی فیس دے کر بال ترشوانا اور آرائشِ گیسو کرانا — ان چیزوں کی مدد سے ۵۰ برس میں ۲۵ برس کی عمر کا سماں پیدا کر لیا جاتا ہے۔ دھیان اُدھر ہے ہی نہیں کہ سامنے ایک قبر تیار ہو رہی ہے اور موت اس کے دروازے سے جب عالمِ آخرت میں لے کے جائے گی تو اُسے نہ عمر کے بارے میں کوئی مغالطہ ہوگا، نہ صحت کے متعلق — سامانِ آرائش — پوڈر، کریمیں لپ اسٹکس، فحش قسم کی انگیائیں (بریسٹرز)، ابرو منڈوا کر ---------- اپنے پسندیدہ رنگ سے جب منشا طوالت اور خم رکھنے والے ابرو بنانے کی پنسلیں۔ موڈیسٹی تو لیے، ازالۂ موئے نامطلوب کی کریمیں اور لوشن، رنگ کو گورا کرنے کے لیے ضمادیات، بالوں کے شمپو وغیرہ کا کاروبار زوروں پر ہے — اِن آرائشی اور فیشنی چیزوں کی ایک دکان پر چند سال پہلے میں نے ایک دوست سے پوچھا کہ بھئی ساری دکان ان چیزوں سے بھر دی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ان کی یومیہ بکری اتنی ہے کہ ہمارا کام خوب چلتا ہے۔ اور قیمتیں اتنی بھاری ہیں کہ خاصا منافع ملتا ہے۔

یہ سارا بوجھ خاوندوں یا باپوں اور بھائیوں کی آمدنیوں پر پڑتا ہے اور وہ بچارے جب زرقِ حلال سے اُسے پورا نہیں کر سکتے تو حرام کے راستوں سے حاصل کرتے ہیں۔

کپڑا خاص طور سے، اور دیگر اشیاء عام طور پر باہر کی خریدنا اور مہنگی قیمتیں ادا کرنا ایک عام وتیرہ ہے۔ باہر کے سامانوں کی باڑہ منڈیاں ایسے لوگوں کی پیاس بجھانے کو موجود ہیں جن کا اپنا کوئی آدمی باہر ملازمت کر کے ضروریات و اضروریات کی فراہمی کرنے والا نہ ہو۔ ان منڈیوں میں بھی، اور مشرقِ وسطیٰ کے ممالک میں بھی بسا اوقات پاکستان ہی کا بنا ہوا نفیس کپڑا اور دوسرا سامان جاپان اور امریکہ کی مہروں کے ساتھ فروخت ہوتا ہے اور غیر پاکستانی مصنوعات کے فدائی ایسی اشیاء کو بڑی ذہنی تسکین کے ساتھ خریدتے ہیں۔

کسی گھر میں چلے جائیے، صوفہ سیٹ سے کم درجے کا فرنیچر تو مشکل ہی سے کہیں ملے گا۔ کچی بستیوں تک میں ایسی چیزیں آپ دیکھیں گے کہ آپ کو پکے مکان میں حاصل نہیں۔ میں نہایت گندے گھروں کے بچوں کو جب تیز شوخ رنگوں اور غیر ملکی ڈیزائنوں کے کپڑے بھدے طریق سے پہنے ہوئے دیکھتا

ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے کسی نے انہیں خیرات میں دیتے ہوں۔ کہیں اپلوں کے ڈھیر اور چولہے اور مٹی کے ٹوٹے ہوئے برتنوں کے پاس ولایتی منظر موس پڑا ملے گا۔ اب یہاں کے نوجوانوں میں "جینز" پہننے کا رواج ہو چلا ہے۔ نیز ہمارے کارخانوں میں یہ کپڑا بننے لگا ہے۔ اس میں کوئی خوبی نہیں۔ صرف اسے پہننے سے یہ لذتِ فخر حاصل ہوتی ہے کہ تہذیبِ بدن پرست کے اُستادوں میں اس کا رواج ہو گیا ہے۔ پتلون پہننے والی خواتین بھی دیکھنے میں آئیں گی۔ واہ ری ترقی!

اگر صحیح معنوں میں آپ کو رفتارِ اسراف کا اندازہ کرنا ہو تو ایک تو اعلیٰ قسم کے سامانوں کی دکانوں اور سٹوروں پر بیٹھ کر اس قوم کا تماشا دیکھیے جسے اقبال نے پکار کر کہا تھا کہ:۔

ع "تو کجا بہر تماشا می روی"۔ دوسرے کسی شادی یا سالگرہ کی تقریب میں شامل ہو کر اندازہ کیجیے کہ ہماری اقتصادی پسماندگی کا راز کیا ہے۔

پچاس پچاس جوڑے کپڑوں کے ـــــ ادھر سے بھی اُدھر سے بھی ـــــ جن میں زیادہ تر "باہر کے" ہوں گے۔ ورنہ ناک کٹ سکتی ہے۔ جہازی سائز کے سنہرے اور قوس قزحی رنگوں میں چھپے ہوئے نقشیں عید کارڈ جن کے نیچے "بیگم فلاں" کا نام شانِ اوّلیت کے ساتھ لکھا ہوتا ہے، دس دس بارہ بارہ تولے سونے کا زیور۔ سو سو آدمیوں کی باراتیں، آٹھ آٹھ سو افراد کے ولیمے، مہمانوں کے لیے چار چار قسم کے شاہانہ کھانے اور پھر پھلوں کے ڈھیر، جن کا خاصا بڑا حصّہ ضائع جاتا ہے، کوکا کولا کی ایک ایک ہزار بوتلوں کا صفایا۔ عظیم الشان مہر (جن کے ادا کرنے کی نیت کم ہوتی ہے) لڑکی والوں سے بھاری جہیز کا مطالبہ۔ مطلوبہ اشیاء (فرج، ٹیلی وژن، سکوٹر وغیرہ) کی فہرست سامنے رکھ دینا۔ بلکہ یہ بھی چاہنا کہ باہر جا کر لڑکے کے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے اخراجات بھی دلہن والے ادا کریں، کیونکہ اُن کا تصور یہ ہے کہ وہ لڑکی والے ہیں۔ پھر ملنے کے ہار، اور اُن کے ساتھ نوٹوں کے ہار، شامیانے اور سیکڑوں بلبوں کی روشنیاں۔ دولت کا دریا بہہ رہا ہوتا ہے۔ لیکن دوسری طرف یہ بدتوفیقی ــ کہ ہزاروں روپے پھونکنے والے گھر میں مہمانوں کو بٹھا کر کھانا کھلانے کا انتظام نہیں۔ جگہ اور خرچ کے بہانے تو یونہی ہوتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ "کلچرل فادر" کی پسند و ناپسند کا لحاظ ہوتا ہے۔

پھر شادی یا تقریب والے گھر میں عورتوں کے لباس و آرائش کا مینا بازار لگ جاتا ہے ـــ پردے کے پرخچے اُڑ جاتے ہیں۔ کوئی پیچھے پردے والی اور نماز پڑھنے والی خاتون (باقی بہ صفحہ ۳۹)

(بقیہ اشارات) ایسے طوفان میں پھنس جاتے تو اُس کی کشتی چکرا کے رہتی ہے۔ وہ گویا رجعت پسندی کا چھوٹا سا جزیرہ ہوتی ہے۔ جس سے چاروں طرف کی لہریں آ آ کے ٹکراتی ہیں۔ غلط روش رکھنے والی اکثریت اس پر یہ احساس مسلط کرتی ہے کہ تم گنہگار رہو۔ دوبئ ازم کی لائی ہوئی دوسری مصیبت یہ ہے کہ خاندان کے نوعمر اور "بوڑھے لونڈے" کئی کئی کیمرے لیے پھرتے ہیں اور دولہا دلہن کے علاوہ اپنی ماؤں بہنوں سے لے کر ہر وارد شدہ خاتون کے چہرے کا شکار کرتے پھرتے ہیں[1]

دولت پرست معاشرے میں شادی بیاہ کے سلسلے میں ایک ایسا رویہ پیدا ہو گیا ہے جو نسائیت کے لیے توہین آمیز ہے۔ پیسے والے لوگ جب رشتے کی تلاش میں نکلتے ہیں تو مالی مفاد پر بھرپور توجہ دیتے ہیں اور پھر شکل و صورت پر، اس کے بعد تعلیم وغیرہ پر۔ خصوصاً لڑکیوں کا حال تو یہ ہو گیا ہے کہ گویا ایک منڈی لگی ہو، اس میں کنیزیں صف باندھے کھڑی ہوں اور پیسے والے لوگ آ کر ایک ایک کو دیکھیں اور کسی کو مالی وجوہ سے اور کسی کو شکل و صورت کے باعث مسترد کرتے جائیں۔ اور سیکڑوں بچیوں اور اُن کے والدین اور بھائی بہنوں کو صدمہ پہنچا کر آخر میں "حسن انتخاب" تک پہنچیں۔ انہی لوگوں نے معاشرے میں نسبت سے پہلے رُو در رُو رشتوں کو دیکھنے اور انٹرویو لینے، بلکہ تعلقات کا ایک دَور گذارنے کا رواج بد پھیلایا ہے۔ اس رویے کی بنیاد جس حدیث پر رکھی جاتی ہے اُس کا منشا یہ ہے کہ نسبت ہو جانے پر ایک نظر دیکھ لینے کی اجازت ہے۔ اور اُس کا مقصد ازدیادِ محبت ہے اس کے علاوہ جو مطلب لیا جا رہا ہے وہ رسولؐ خدا کی بات نہیں ہے۔

گھر کے بڑوں اور بچوں کی سالگرہوں کا سلسلہ سال بھر چلتا ہے۔ دو چار تقریبیں ہو جاتی ہیں۔ لوگ آتے ہیں۔ وہی لباس و آرائش کی بہار اور وہی دعوت و میزبانی۔ اس کے ساتھ تحائف کا سلسلہ چلتا ہے۔ کئی سرکاری افسروں کو تو ماہرینِ فن اسی بہانے سے رشوتیں ادا کرتے ہیں۔

---

[1] میرا خیال یہ ہے کہ ہم خیال خادمانِ دین جہاں کہیں بھی ہوں، مل بیٹھیں اور مستقلاً یہ ضابطہ کر لیں کہ ایسی مسرفانہ اور نمائشی تقریبوں میں وہ شرکت نہیں کریں گے ـــــ خواہ وہ خاندان میں ہوں یا دوستوں میں یا کسی اور دائرے میں ـــ ایسے موقعوں پر اپنا نقطۂ نظر مضبوط انداز میں بتا دینا چاہیے۔ اس طرح کی اجتماعیت کی قوت اس طوفان کا مقابلہ کرنے کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ ورنہ یہ معاشرہ ہم آپ سب کو آہستہ آہستہ بہا لے جائے گا۔ ہمیں نہیں تو (باقی برصفحہ آئندہ)

مختصر یہ کہ ہمارا معاشرہ صرف دولت پرست اور اسراف پسند نہیں، نمائش دولت کا مریض بھی ہے۔ سو روپے آمدنی والا دکھائے گا کہ اسے ہزار روپے ملتے ہیں، اور ہزار والا دکھائے گا کہ وہ لاکھوں میں کھیل رہا ہے۔ وہلم جرا۔

یہ نمائش دولت اس لیے ضروری ہوگئی ہے کہ اب دولت ہی مرتبے کا معیار ہے۔ اب انسانوں کو ان کی انسانیت، اُن کے اخلاق اور ان کی خدمات کے معیار سے نہیں پرکھا جاتا۔ بلکہ سب سے برتر روپیہ ہے۔ یہ بات آج نئے معنوں میں پوری طرح برحق ہوگئی ہے کہ "زر کسوٹی ہے انسان کی"۔ دوستیاں اور رشتہ داریاں، میل جول اور دعوتیں اب اُن لوگوں میں چلتی ہیں جن کی مالی سطح برابر ہے۔ سائیکل والا سائیکل والے کے ساتھ، سکوٹر والا سکوٹر والے کے ساتھ، موٹر والا موٹر والے کے ساتھ اور دوبئی والا دوبئی والے کے ساتھ چل سکتا ہے اور ربط رکھ سکتا ہے۔ بڑے سے بڑا جذبۂ اسلامی بھی لوگوں کو اجتماعات میں تو اکٹھا کر سکتا ہے، مگر مختلف سطحوں کے افراد کے درمیان ذاتی دائرے میں برادرانہ اور دوستانہ ہم آہنگی نہیں پیدا کر سکتا۔ کسی عالم یا ادیب یا نیک نہاد آدمی کا معاشرے میں کتنا سا احترام کرتے ہوئے لوگ چار تعریفی جملے کہہ دیں گے، لیکن حقیقی قرب مالی معیار کے مطابق ہی رکھیں گے اور حقیقی احترام مالی برتری ہی کا کریں گے۔

بنا بریں معاشرے میں نمائش دولت کا رجحان زور پکڑتا جا رہا ہے۔ ہر شخص اس بات کو ثابت کرنے کے درپے ہے کہ میں امیر کبیر آدمی ہوں۔

بھارت سے آنے والے غیر مسلموں اور مسلمانوں دونوں نے ہماری زندگیوں کی یہ بہار دیکھی تو ان کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) ہمارے سامنے ہمارے اہل و عیال کو کسی قدر زور لگائے بغیر چارہ نہیں۔

خادمانِ دین کو سادہ تقریبات کی اعلیٰ اور روشن مثالیں قائم کرنی چاہئیں جن کی تقلید کرنے کا جذبہ دوسروں میں بھی پیدا ہو۔ تب اگر ہم مسرفانہ رسمداریوں کے خلاف تبلیغ و تلقین کریں گے تو وہ بہت اثر انگیز ہوگی۔ یہ ایک بڑا مغالطہ ہے کہ اس طرح کی تقریبیں منعقد کر کے یا اُن میں شریک ہو کر ہم دین یا سیاست کی کوئی خدمت کر سکیں گے۔ دین کی خدمت کسی مخالفِ دین ماحول میں نہیں ہو سکتی اور نہ لوگوں کی سیاسی آرا اس طرح بدل سکتی ہیں۔ ایسے کاموں کے لیے آپ الگ سے لوگوں کو کسی ضیافت پر یا ضیافت کے بغیر جمع کرتے رہیے۔ آخر دولت پرستی اور نمائش و اسراف و دولت کی سرپرستی کی کیا ضرورت؟

منہ کھلے کے کھلے رہ گئے کہ پاکستان نے تو بڑی ترقی کی ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ بھارت کی حکومت لوگوں کے لیے معمولی گذر بسر کی گنجائش دے کر قومی دولت کا بڑا حصہ صنعت، تجارت، زراعت اور دفاعی ضرورت پر خرچ کر رہی ہے۔ انہیں معلوم نہیں کہ ہم پشتینی نواب ہیں اور شاہانہ مزاج کے لوگ ہیں۔ جو آیا سو چپٹ اور جو ابھی نہیں آیا وہ پیشگی صاف۔

یہ ہے اصل راز ہماری اقتصادی پسماندگی کا، جسے حل کرنے کے لیے ترقی کے فلسفوں اور اقتصادی اسکیموں کے بجائے اسلام کے صرف ایک اصولِ تحدید کو استعمال کرنا کافی ہو سکتا ہے۔ وہ یہ کہ دولت کمائیے، کاروبار چلائیے، روپیہ جمع کیجیے۔ مگر آپ کسی بھی دائرہ زندگی میں ایک خاص حد سے زیادہ رقم استعمال نہیں کر سکتے۔ بعض چیزیں خرید نہیں سکتے۔ بعض کو رکھ نہیں سکتے، بعض کو درآمد نہیں کر سکتے۔ بعض مقداروں سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔

اُوپر جو معاشرے کی دولت پسندی اور اسراف پسندی اور نمائش دولت کے اطوار کو بیان کیا گیا ہے تو اس لیے نہیں کہ ہمیں یہاں اقتصادی حالات کا جائزہ لے کر کوئی اسکیم بنانی ہے۔

بلکہ مدعا یہ واضح کرنا ہے کہ ایسے معاشرے میں رہ کر اس کے افراد تک دعوتِ اسلامی پہنچانے والوں کو (خواہ اُن کا تعلق کسی بھی جماعت یا گروہ یا فرقے سے ہو) کن خطرات سے آگاہ ہونا چاہیے۔

پہلی بات یہ ہے کہ ایسے دولت پرست معاشرے میں اُن افراد کا تناسب کم ہو جاتا ہے۔ جو خدا اور رسول کی بات کو تفصیل سے سُنیں اور سمجھیں اور دین کے تقاضوں کو جانیں۔ حصولِ زر کی دوڑ میں (جسے ریڈیو کے ایک نشریے میں چوہوں کی دوڑ کہا گیا ہے) ہانپتا ہوا انبوہ سرسری جذباتی باتیں سُن کر نعرے لگا سکتا ہے مگر تھوڑی دیر بعد سب کچھ بھول بھال کر کسی اور نعرے کے لیے بھی گلا پھاڑ سکتا ہے۔ ضروری ہے کہ اس دوڑ میں ہانپنے والوں کو ذرا دیر کے لیے سستانے کی دعوت دی جائے اور اُن کا ذہن جب کچھ سکون میں آئے تو پھر "حسن اپنا قصہ چھیڑے"۔

انتخابی جلسوں کا یہ انداز گفتگو کافی نہیں ہے کہ واہ وا، ہمارے عوام بڑے اچھے ہیں، اور وہ بس اسلام کے لیے مرمٹنے کو تیار اور اسلامی نظام کی برکتوں کو سمیٹنے کے منتظر ہیں۔ حالانکہ یہ عوام پوچھا کرتے تھے کہ اسلام آجائے تو وہ ہمیں کیا دے گا؟ تنخواہ اور اُجرت میں کتنا منافع ہوگا؟ روٹی،

کپڑے، مکان کے لیے کیا انتظامات؟ وغیرہ - وہ اسلام سے کچھ لینا چاہتے ہیں۔ دینے کے بارے میں انہوں نے آپ سے کبھی سوال نہیں کیا۔

دوسری یہ کہ ایسے معاشرے میں اگر اسلام کے اصول، عادات، قوانین، پردے کے ضوابط یا اخلاقی قدروں کو کوئی حکومت بھی نافذ کرنا چاہے تو دولت پرستی مزاجوں کو اتنا بگاڑ دیتی ہے کہ یا تو وہ دینی تقاضوں سے بغاوت کرتے ہیں یا اگر پابندی کریں بھی تو منافقانہ انداز سے کرتے ہیں اور ان تقاضوں کے خلاف چہ میگوئیاں اور طنز و تعریض بھی جاری رکھتے ہیں۔ خصوصاً ایسے کمزور عناصر کو تاک کر جب کمیونسٹ اور ملحد اور مغرب پرست لوگ اسلام کے خلاف استعمال کرنا چاہیں تو یہ ان کے لیے بڑے کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔

تیسری بات یہ کہ موزوں افراد کو ڈھونڈنے اور ان پر اثر انداز ہونے کے لیے محنت زیادہ کرنی پڑتی ہے اور وقت زیادہ صرف ہوتا ہے۔ اگر اہلِ دعوت زیادہ وقت اور محنت صرف کرنے اور کم نتیجہ حاصل کرنے کے مشکل عمل سے کترائیں تو غلبۂ دین کی ساری اسکیم کی بنیادیں کمزور ہو جاتی ہیں۔

چوتھی یہ کہ ایسے معاشرے میں بہت سے اہلِ دولت ایسے ملتے ہیں جو اپنی بھاری آمدنی کا ایک فیصد یا ½ ۱ فیصد دین کے لیے پیش کر کے محسنِ اسلام بن جاتے ہیں، اور مزے سے اپنی زندگی کی اصل مہم میں مصروف رہتے ہیں۔

پانچویں یہ کہ غلبۂ دین کی ساری تگ و دو کی ذمہ داری کا بڑا حصہ غریب رضاکاروں کے حصے میں چلا جاتا ہے جو دولت پرست معاشرے میں مہنگی زندگی بسر کرنے کے لیے پوری آمدنی حاصل نہیں کر سکتے۔ وہ قربانی دے کر بھاری کام کرتے ہیں، مگر دولت پرستوں کا معاشرہ انہیں "مولوی ملا" کہہ کر داد دیتا ہے۔

اب آیئے دوسری جانب!

دولت پرست معاشرے میں اسلام کے جو نقیب کام کرتے ہیں، وہ اسی معاشرے میں رہتے بستے ہیں، چلتے پھرتے ہیں، رشتے اور تعلقات پیدا کرتے ہیں، ان کے بیوی بچوں کی بھی ایک دنیا ہوتی ہے۔ پس وہ بھی ہزار مزاحمت کے باوجود دولت پرستانہ اور مسرفانہ رجحانات سے بچ نہیں سکتے۔ میں یہاں انتباہاً ان اثرات کا ذکر کرتا ہوں، جو پیدا ہو سکتے ہیں اور پہلے سے ہر شخص کو تحفظ کی فکر

کرنی چاہیے۔

پہلا اثر یہ پڑتا ہے کہ برسوں سے زندگی میں جو واحد غالب نصب العین اقامتِ دین کا کام کرتا تھا۔ اور جس کے لیے ہر دوسرے مفاد کو قربان کر دیا جاتا رہا اور جس کے لیے نقصانات گوارا کیے جاتے رہے، اس کے متوازی دوسرا نصب العین معاشی ترقی کا یا تو برابر کے زور سے کام کرنے لگتا ہے یا اولین نصب العین سے آگے بڑھ جاتا ہے۔ بظاہر یہ ناجائز نہیں کہ آپ معاشی کمی کو پورا کرنے اور رشتہ داروں یا ہمسایوں کے برابر آنے کے لیے بہت زیادہ کام کرنے لگیں۔ دو دو تین تین مشغلے پیدا کر لیں۔ گھر کے سا۔ سے افراد کچھ نہ کچھ حصہ اس عزم سے ادا کرنے لگیں کہ مل جُل کر اس مونٹ ایورسٹ کو سر کرنا ہے تو اوّل نظر میں اس میں کوئی قباحت نہیں نظر آتی۔ مگر حقیقت میں یہ نقشہ احوالِ اقامتِ دین کے علمبرداروں کی قوتوں کا بڑا حصہ اِدھر سے نکال کر اُدھر ڈال دیتا ہے۔ معاد کا کام تو معاش کی قربانی سے ہوتا ہے۔ اگر معاد اور معاش دونوں کو برابر کی اہمیت دی جائے تو نصب العین میں ایسا شرک پیدا ہو جاتا ہے جو خدمتِ دین کے لیے نقصان دہ ہے۔

اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دُعا سکھائی تھی کہ دُنیا کو ہمارے لیے "ہمّ اکبر" کا باعث نہ بنا دے۔ اسی معنی میں حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا تھا کہ کوئی شخص خدا اور دولت کی خدمت بیک وقت نہیں کر سکتا۔ یعنی دونوں میں سے ایک چیز کو اوّلیت و فوقیت دینی ہوگی اور دوسری کو اس کے تابع کرنا ہوگا۔

میں نے کتنے ہی لوگ دیکھے جن کا جذبہ یہ تھا کہ ہم ذرا کچھ مدت محنت کر کے ایک مرتبہ زیادہ بڑی کمائی کرنے لگ جائیں تو پھر خوب دل کھول کر دین کی خدمت کرنے لگیں گے، مگر جب وہ معاشی ترقی کی راہ پر آگے بڑھے تو پیچھے پلٹنا مشکل ہو گیا۔ کام دام تو وہ کیا کر سکتے تھے۔ بس جو ذرا اچھے لوگ تھے وہ چند روپے دین کے لیے خرچ کرنے لگے اور جو کمزور تر تھے وہ "کانِ نمک" میں جا کر نمک ہی بن گئے۔

؎ کاں را کہ خبر شد خبرش باز نیامد

مجھے کوئی ایسا دولت بڑھانے والا نہیں ملا جس نے اپنے اضافۂ دولت یا اس کے بڑے حصے کو عزائم کے مطابق اپنے اور گھر والوں کے مطالبات کی زد سے محفوظ رکھ کر خدا کی راہ میں خرچ کرتے رہنے کی نظیر قائم کر دی ہو۔

اپنے واحد نصب العین سے وابستگی اور اس کی برتری کا اندازہ کرنے کے لیے یہ دیکھنا چاہیے کہ ہمارے اوقات، قوتوں اور قابلیتوں اور دولت کا کتنے فیصد حصہ دین کی خدمت کے لیے صرف ہوتا ہے، اور یہ حصہ دولت افزائی کی مہم سے پہلے کتنا ہوتا تھا۔

جن لوگوں کو کوئی بڑا کام کرنا ہوتا ہے ——— اور دین کے کام سے بڑا کام کونسا ہوگا ——— وہ دنیوی اُمنگوں اور حوصلوں اور بہت سے رنگین خوابوں کے شیشہ خانے توڑ کر بیڑا اُٹھاتے ہیں۔ دین کی سربلندی کا کام اتنا جزوی اور ضمنی قسم کا نہیں ہے کہ بس اپنا سب کچھ اور اطراف میں کھپانے کے بعد چند لمحے اِدھر بھی صرف کر دیئے، دس باتیں اِدھر بھی کہہ لیں، اور چار پیسے اِدھر بھی خرچ کر دیئے۔

دوسرا اثر یہ پڑتا ہے کہ آدمی دین کی روشنی میں اپنے طے کردہ اور اختیار کردہ اصولوں اور ضابطوں کی پابندی میں آہستہ آہستہ ڈھیلا ہونے لگتا ہے، کیونکہ "دولت دنیا" اپنی قیمت ضرور وصول کرتی ہے۔ وہ ہر معاملے میں جواز کی راہیں تلاش کرتا ہے، حالانکہ اوّلاً خدمتِ دین کی راہ میں اچھے لوگوں کا رویہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کرید کرید کر ناجائز چیزوں کو زندگی سے خارج کرتے ہیں۔ آدمی ہر طرف سے مجبوریوں اور اضطراریوں میں گھرتا چلا جاتا ہے۔ اس طرح وہ اخلاقی معیار مدہم رفتار سے درہم برہم ہونے لگتا ہے جس کے بغیر دعوتِ اسلامی کا کام کما حقہٗ نہیں کیا جا سکتا۔

تیسرا اثر دولت افزائی کی پُرزور سرگرمیوں کا آدمی پر غیر شعوری طور پر پڑتا ہے کہ وہ بھی دوستیوں اور رشتہ داریوں کے لیے مالی ہم سری کو بنیاد بناتا ہے۔ تعلقات دوسروں سے بھی ہوتے ہیں مگر واجبی حد تک حقیقی محبتیں اور احترام اور بے تکلفانہ رابطے ایک خاص دائرے سے متعلق ہو جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ رشتوں کے معاملے میں حدیث نبویؐ کی ہدایت کے بخلاف پہلی صفات جو دیکھی جانے لگتی ہیں وہ دولت اور صورت ہیں۔ دولت بسا اوقات صورت سے بھی آگے چلی جاتی ہے۔ دینی پہلو سے اتنا کافی سمجھا جاتا ہے کہ لڑکا شریف ہے۔ کسی مذہب دشمن گروہ سے تعلق نہیں رکھتا یا نماز روزہ کر لیتا ہے۔ میرے سامنے ایسی مثالیں کم ہیں کہ لوگ سب سے پہلے دینی پہلو سے جانچیں اور اُسے پوری اہمیت دیں، اور باقی چیزوں کو بعد میں۔ نہ ایسا دیکھنے میں آتا ہے کہ کسی نے محض اس لیے دولت مند گھرانے کو مسترد کر دیا ہو کہ لڑکا یا لڑکی یا اس کا گھرانہ دینی لحاظ سے پھسڈی ہے۔

اسی طرح یہ بھی شاید ہی کہیں ہوتا ہو کہ کسی غریب کے رشتے کو محض اس لیے ترجیح دی جائے کہ وہ دینی معیار کے لحاظ سے افضل ہے۔ یعنی اگر دو باتیں آمنے سامنے رکھی جائیں کہ ایک طرف "دولت جمع تھوڑی سی مذہب داری" ہے اور دوسری طرف غریبی (یا معتدل گذر بسر) کے ساتھ مضبوط اہتمامِ دین ہو تو ہمارے ملک کے دینی حلقوں میں بھی بالعموم پہلی صورت کو ترجیح دی جائے گی، اور دوسری صورت شاذ ہی کہیں ملے گی۔ یعنی کہ دوسری صورت میں اچھی خاصی تعلیم کا ہونا بھی زیادہ فرق نہ پیدا کرے گا۔ ہاں غریب گھروں کے لوگ دوسری صورت کو اس لیے قبول کر لیں گے کہ وہ خود غریب ہیں۔

چوتھا فرق یہ واقع ہوتا ہے کہ لذات اور آسائشوں کے لحاظ سے اپنے مرتبے کو بلند کرنے کے بعد خدمتِ دین کی سرگرمیوں میں کمی آجاتی ہے اور خصوصاً عوام کی سطح پر تکلیف دہ کام کرنے میں آدمی پھسڈی ہو جاتا ہے۔

پانچواں فرق یہ کہ آسائشوں میں گھرا ہوا انسان دین کے اعلیٰ مقصد کو محبوب بنا کر دشت پیمائیاں اور کوچہ گردیاں نہیں کر سکتا۔

چھٹا فرق یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر مضبوط ایمان اور دینی شعور موجود نہ ہو تو بسا اوقات ایک مذہبی آدمی کے دل میں مالی لحاظ سے پیچھے ہونے کی وجہ سے ایک احساس کمتری ایسا گھر کرے گا کہ کما حقہ اثر انداز نہ ہو سکے گا۔ حالانکہ اس معاشرے میں دینی لحاظ سے فروما یہ لوگوں کو اپنے ایمانی و اخلاقی افلاس کی وجہ سے کوئی احساس کمتری لاحق نہیں ہوتا۔

اختصار کا تقاضا ہے کہ استقصا نہ کیا جائے۔ اِن اشارات سے سمجھا جا سکتا ہے کہ دولت پرست مسرفانہ معاشرے میں کام کرنے والے محبانِ دین کے لیے بھی کتنے خطرات ہیں۔ وہ دوسروں کو طوفان میں ڈوبنے سے بچانے کے لیے خود بھی حوالۂ طوفان ہو سکتے ہیں۔ ورنہ تردامنی تو کہیں گئی نہیں۔

ان خطرات سے بچنے کے لیے خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں جو ہدایات دی ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے:۔

—— اچھا مسلمان وہی ہو سکتا ہے جو رزقِ کفاف پر اکتفا کرے (اور بقیہ وقت خدا کی عبادت

دین کی سربلندی اور انسانوں کی فلاح میں صرف کرے۔

——— اسلام پر چلنے والوں کو اس تصور کے مطابق دنیا سے معاملہ رکھنا چاہیے کہ وہ یہاں محض مسافرانہ حیثیت سے گھڑی دو گھڑی کے لیے وارد ہیں۔ منزل تو آگے ہے۔

——— معاشرے میں دولت کی افراط ایمان کے لیے آزمائشیں اور لوگوں کے درمیان نزاعات اور سازشیں بڑھا دیتی ہے، لہٰذا ایسا وقت آنے کے متعلق حضورؐ نے تشویش کا اظہار فرمایا۔

——— زائد آمدنی و دولت کا مصرف انفاق فی سبیل اللہ بتایا۔ یعنی اسے اللہ کے دین کو غالب کرنے اور اس کے مصیبت زدہ بندوں کو سہارا دینے کے لیے استعمال کیا جائے۔ حضورؐ نے اُخروی حساب سے نجات کی راہ ہاتھوں سے اشارہ کر کے یہ بتائی کہ وہاں وہ بچے گا جو اس طرح اور اس طرح دولت کو چاروں طرف (دین کی سربلندی اور بندوں کی بھلائی کے لیے) لٹاتا پھرے۔ چنانچہ ہماری تاریخ میں یہ مثالیں پیدا ہوئیں کہ لاکھوں اشرفیاں پا کر ایک شخص دو منٹ میں دوسروں میں تقسیم کر دیتا ہے اور ایک دوست دوسرے کی مشکلات کا خیال کر کے اپنا مال اُسے بھجوا دیتا ہے۔

——— تعلیم یہ دی کہ دنیوی جاہ و مال کے معاملے میں مسابقت نہ کی جائے، اور کوئی اپنے آگے والوں کو دیکھ کر اُن کے رشک میں پڑنے کے بجائے اپنے سے پیچھے رہ جانے والوں کی مصیبتوں کو دیکھے اور خدا کا شکر ادا کرے۔

——— یہ نصیحت بھی فرمائی کہ خادمانِ دین کو پہلے ہی دن یکبارگی ان تمام عمارات، ساز و سامان اور غیر ضروری آسائشوں اور آرائشوں سے اپنے آپ کو ہمیشہ کے لیے مایوس کر لینا چاہیے جو اُسے دوسروں کے پاس دکھائی دیتی ہیں۔ فیصلہ کر لے کہ میں ان چیزوں کے لیے نہیں تڑپوں گا۔ قرآن مجید میں بھی آیا کہ مخالفین یا مغفلین کی دولت و زینت کو دیکھ کر تمہاری آنکھیں مرعوب نہ ہونے پائیں۔

——— آمد و صرف کے تمام حرام اور ناجائز راستوں کو اپنے اُوپر ہمیشہ کے لیے بند کر لینا چاہیے۔

میرا خیال ہے کہ اس سے زیادہ تفصیل میں جانا ضروری نہیں، کیونکہ حضورؐ نے صرف یہ نصائح ہی نہیں فرمائیں بلکہ سب کچھ ہوتے ہوئے تنگی ترشی کی درویشانہ زندگی گذار کر دکھا دیا کہ صحیح رویہ کیا ہے۔ بعض حضرات کا یہ کہنا کہ درست بھی ہو کہ حضورؐ کا مقام عام اُمتیوں سے ارفع ہے تو میں حضورؐ ہی کے تیار کردہ صحابہ کی وسیع سوسائٹی کو سامنے رکھ کر کہوں گا کہ آپ حضرت ابوذرؓ اور اصحابِ صفہ سے لے کر

حضرت عثمانؓ غنی اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف تک سب کو دیکھ جایئے۔ کسی نے ذاتی زندگی کو عالیشان بنانے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ دولت مندوں نے بھی اپنی دولت کو ہمیشہ خدا کے دین اور خدا کے بندوں کی خدمت کے لیے استعمال کیا۔

اتنا ہی نہیں، اُمت میں جب بھی کوئی انقلابی کام کرنے والا اُٹھا اور جن مبلغین اور صوفیاء نے خدا کا پیغام پھیلانے کی مساعی کیں، ان کی بیشتر تعداد نے ہمیشہ فاقہ مستی اور سادہ معاشرت کے ساتھ کام کیا، اور ان کے کام کے نتائج آج آنکھوں سے دیکھے جا سکتے ہیں۔ ہمارے اپنے اِس خطّے میں تحریک مجاہدین ابھی کل جاری رہ چکی ہے۔ اس کے متوسلین، اور خصوصاً اس کے قائدین (خدا اُن پر انعام فرمائے) نے سادہ ہی نہیں، سخت کٹھن زندگی گذاری۔ نتیجہ یہ کہ ظاہری شکست کے باوجود تاریخ پر اتنا گہرا اثر چھوڑ گئے کہ بعد میں تمام تحریکات میں اُن کی رُوح کچھ نہ کچھ شامل رہی۔ آج کی تازہ مثال امام خمینی کی ہے کہ وہ شخص جو کروڑوں افراد کے دلوں پر حکومت کرتا ہے، اُس کا رہن سہن اور کھانا پہناوا کیا ہے۔

آج کے عقلی دَور میں کچھ دوست یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ تو دین کا اخلاقی پہلو ہے۔ میں جواب میں کہوں گا کہ خدا اور رسولؐ نے اخلاقی ہدایات بھی محض سفارش کے طور پر نہیں دی ہیں، بلکہ وہ بھی ایک قانون ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس قانون کو رضاکارانہ جذبے سے تسلیم کرنے کا مطالبہ ہے۔ جس نے تسلیم نہیں کیا، وہ یہ نہ سمجھے کہ اس سے کوئی مطالبہ ہی نہ تھا۔ اپنے اخلاقی پہلو کے استحکام کے بغیر دین کا قانونی نظام بھی کام نہیں کر سکتا۔ دولت کو اگر کوئی شخص خدا کی امانت سمجھ کر آمد و خرچ کے ایک ایک پیسے پر کڑی نگاہ نہیں رکھتا تو اُسے جاننا چاہیے کہ لَتُسْئَلُنَّ عَنِ النَّعِيْمِ۔ مال کے متعلق اس سوال کا جواب دینا پڑے گا کہ اَيْنَ اكْتَسَبَ وَفِيْمَ اَنْفَقَ۔

ذرا غور فرمایئے کہ ایک شخص بھوکوں مرتی ہوئی آبادی کے سامنے ٹھاٹھ دار دعوتیں اور ضیافتیں کرتا ہے، نکاح کے سادہ سے معاملے کو دھوم دھام کی تقریب بنا ڈالتا ہے۔ مکان، فرنیچر، لباس، کراکری، تین تین کاروں، قالینوں اور دوسری غیر ضروری ضروریات پر لاکھوں روپے اُڑا دیتا ہے تو کیا وہ خدا کے ہاں یہ کہہ کر چھوٹ جائے گا کہ دولت میری اپنی تھی اور میں نے اپنے قانونی حقِ ملکیت کو استعمال کیا ہے۔ ہرگز نہیں۔ ایک پیسہ بھی جب ہم "غیر ضروری ضروریات" پر خرچ کرتے ہیں، جبکہ

ایک طرف خدا کا دین ہم سے مطالبہ ایثار کر رہا ہوتا ہے اور دوسری طرف غربت زدہ قوم کی اکثریت اپنا حق مانگ رہی ہوتی ہے تو میں نہیں سمجھتا کہ اس پیسے کا خرچ محض اس لیے جائز ہے کہ قانون نے کسی شخص کا ہاتھ نہیں پکڑا۔ اگر کسی معاشرے کے تمام لوگ اس طرح سوچنے لگیں تو پھر تو اسلام کے اخلاقی تقاضوں کو بھی قانون کی قوت سے نافذ کرنا پڑے گا۔

آخر کوئی گروہ تو ایسا ہونا چاہیے کہ جو دولت پرستی اور اسراف پسندی کے طوفان سے اپنا سر اوپر ابھار کر دوسروں کو بہتری کی تلقین کر سکے اور معاشرہ جس اضطراب افزا بیماری میں پڑ گیا ہے، اس سے نکالنے کے لیے کوشش کر سکے۔ سیاسی طور پر یہ فریضہ حکام و افسران اور لیڈروں پر عاید ہوتا ہے۔ لیکن میں زور دوں گا کہ اس کا زیادہ بار اہل دین کے سر آتا ہے اور وہ اگر پورا زور لگائیں تو معاشرے کو دولت پرستی کے گرداب سے نکال سکتے ہیں لیکن جہاں علماء اور حکام خود ہی بتِ دولت کے رام ہو جائیں، وہاں عوام کی چارہ گری کون کرے۔

دین کی خدمت جبھی ممکن ہے کہ آدمی زندگی کا مرکزی اوّلین نصب العین فروغِ دین ہی کو قرار دے۔ دنیوی لحاظ سے مطمحِ نظر رزق کفاف کو رکھے، زائد ملے تو اسے خدا کی راہ میں خرچ کر دے۔

اس معاملے میں اعلیٰ درجے کا معیار اگر نہیں تو کسی درجے کا معیار تو ہونا چاہیے۔ یہ امر طے کر لینا چاہیے کہ ہم کسی معاملے میں فلاں لکیر سے آگے نہیں بڑھیں گے۔ اگر کوئی لکیر نہ ہوگی تو پھر آدمی دنیا طلبی کی راہ میں قدم بقدم آگے ہی بڑھتا جائے گا اور اس کا نتیجہ دعوتِ حق کے پھیلاؤ میں کمی کی صورت میں ظاہر ہوگا۔

خدا کے لیے ازدیادِ دولت کی مہمات اور نمائشِ دولت اور حب الشہوات کے اصرو اغلال کو اتار پھینکیے، اور میخانہ اسراف کی سرمستیوں سے نکلیے، پھر آپ خود بھی خدا سے قریب ہو سکیں گے اور اس کے بندوں میں خدا کی دعوت کو مؤثر بھی بنا سکیں گے۔

مطلوب یہ نہیں کہ آپ نرے سادھو اور مہنت ہی بن جائیں۔ بس ایسا جادۂ اعتدال اختیار کریں کہ کچھ نسبت ماضی کی درخشاں مثالوں سے بھی رہے، اور موجودہ حالات میں پنپنے کی بات بھی بنی رہے۔